ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

تزئین فاطمہ
پی ایچ۔ڈی سکالر، شعبۂ اردو، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر تقدیس زہرا
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

مستنصر حسین تارڑ کے ناول "خس و خاشاک زمانے" کا ایک اور پہلو

Tazeen Fatima
Ph.D Scholar, Department of Urdu, Lahore College for Women University, Lahore.
Dr. Taqdees Zahra
Assistant Professor, Department of Urdu, Lahore College for Women University, Lahore.

Another Aspect of Mustansar Hussain Tarar's Novel "Khas-o-Khashak Zamany"

Mustansar Hussain Tarar holds a prominent place in Urdu literature. His novel with the name of "Khas-o-Khashak Zamanay" was published in 2010. This novel has a vast canvas and a very composed plot . Excellent characterization, beautiful sceneries, fiction, magical realism and flashback technique has made this novel unique in its genre. In this novel, a history of hundred years and almost one hundred and fifty characters have been extraordinarily presented in very simple and elegant language. Plot is multi-directional but composed which opens up layer by layer and the reader enters from one era of history to the next. The novel opens new horizons of cognition for the reader – Accidents transform into thoughtful events with the flow of time and present keeps on changing into past. In this flow of time customs, values and traditions devalue like straws and keep moving on the high tide of time. This aspect that how the racial differences fade out, the differentiation between aristocrats and vile of the society diminishes and urge of acquisition of wealth makes people both of high and low statures stand on the same ground, has been reviewed in this article.

Keywords: *Vast canvas, Magical realism, History, New horizon, Past and Present, Flow of time, Traditions, Customs. Racial differences, Acquisition of wealth.*

مستنصر حسین تارڑ کا ناول "خس و خاشاک زمانے" ایک غیر معمولی ناول ہے۔ سات سو چالیس (۷۴۰) صفحات پر مشتمل اس ناول میں تقریباً ایک صدی کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس ناول میں بظاہر کوئی ایک موضوع نہیں ہے۔ یہ انسان اور اس کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی مجبوریوں کی کہانی ہے۔ تقسیم سے قبل ہندو پاک کے حالات، تقسیم کے نتیجے میں برپا ہونے والے فسادات، تقسیم کے بعد جائیدادوں کی بندر بانٹ، ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ، ۱۹۷۱ء کی جنگ اور اس کے نتیجے میں سقوط ڈھاکہ کا سانحہ، ۲۰۰۱ء میں ۱۱/۹ کے واقعات، ان واقعات کے نتیجے میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے عراق اور افغانستان پر حملے اور ان حملوں کے ردِ عمل میں مسلم عوام کے تاثرات، ڈنمارک میں توہین آمیز کارٹونز کی اشاعت کے بعد مسلم اُمہ میں پائی جانی والی بے چینی اور اضطراب اور پاکستانی عوام کا ردِ عمل یہ سب اِس ناول کا موضوع بنتے ہیں۔

۱۱۲۔ ابواب پر مشتمل کثیر الجہات پلاٹ کے اس ناول میں واقعات پرت در پرت کھلتے ہیں۔ کہانی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہے تاہم پلاٹ کی بنت کمزور نہیں۔ اس ناول میں ایک سو چھیالیس (۱۴۶) کردار ہیں جن میں سے چھبیس (۲۶) کردار نمایاں ہیں اور ناول کے موضوع اور فکر کے حوالے سے اہم ہیں جب کہ باقی ایک سو بیس (۱۲۰) کرداروں میں سے چند ایسے ہیں جو محض مختلف تہذیبوں کی وضاحت کے لیے مصنف کے مدد گا رہیں۔

وسیع کینوس کے اس ناول میں فلیش بیک تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے اور بہت سے موضوعات پیش کیے گئے ہیں۔ منشا یاد اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "اس ناول کا کوئی ایک موضوع متعین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہر اچھے ناول کی طرح یہ بھی اپنے اندر زندگی کے سارے ہی رنگ اور ذائقے لیے ہوئے ہے اور اسے کسی ایک جگہ، ملک اور زمانے تک محدود نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں کئی زمانے اور برصغیر پاک و ہند اور دنیا کے بہت سے اہم واقعات و سانحات اور تاریخی حوالے ملتے ہیں۔ اس میں بہت سی محبتوں کا ذکر ہے لیکن یہ روایتی عشق و محبت کا افسانہ نہیں۔ اس میں بہت سی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی خواہشوں اور کوششوں کا ذکر ہے لیکن یہ کسی انقلاب کا نعرہ نہیں لگاتا۔ روشن خیالی کی بہت

سی باتیں اس ناول کی اساس ہیں اور اس میں گرے پڑے طبقے کے حقیر سمجھے جانے والے لوگوں کی ان گنت حکایتیں ہیں لیکن یہ سوشلزم، کمیونزم یا ترقی پسندی کے کسی فارمولے کے تحت لکھا گیا ناول نہیں، البتہ آپ مصنف کو اس کی روشن خیالی اور اس کے عقلی اور استدلالی نقطۂ نظر کی داد تو دے ہی سکتے ہیں۔" [1]

اِن "اَن گنت" حکایتوں سے بیسویں صدی کی ہنگامہ خیز زندگی جھلکتی ہے۔ برعظیم پاک وہند میں تقسیم سے قبل کا پنجاب، پنجاب کی ثقافت، صدیوں پرانا تہذیبی نظام جس میں ہندو، مسلم اور سکھ مل کر رہتے تھے۔ برادری ازم جس میں جاٹ اپنی برادری کو برتر سمجھتے ہیں خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، جاٹوں کا دوسری ذاتوں اور برادریوں کے لوگوں کے ساتھ سلوک، اس کے علاوہ جاٹ برادری کا تعلیم کے حصول کو قابلِ نفرت سمجھنا، برطانوی سامراجی دور میں فرنگی حکومت کا جلیانوالہ باغ میں برعظیم کے انسانوں کا قتل عام، پنجاب کے دیہی علاقوں میں تقسیم کے اثرات، دونوں اطراف انسانیت کے ساتھ ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک، انسانی لاشوں سے بھری ریل گاڑیوں کے تبادلے، ایک خاندان بن کر رہنے والے لوگوں کا ایک دوسرے کا جانی دشمن بن جانا سقوطِ ڈھاکہ کے بعد پاکستان میں سیاسی عدم استحکام، اسلام کے نام پر ہونے والے مظالم، صحافی اور دانشور طبقے کی ناقدری اور انھیں ترکِ وطن پر مجبور کر دیا جانا، تارکینِ وطن کی امریکا اور کینیڈا جیسے ممالک میں زندگی اور اس کی مشکلات، ۱۱/۹ کے واقعات کے تارکینِ وطن پر اثرات، اسلام کا دہشت پسند مذہب گردانا جانا اور مسلمانوں کا قابلِ نفرت سمجھا جانا، یہ سب اس ناول کا موضوع بنتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ ایک بہت اہم موضوع یہ ہے کہ وقت کی گردش سے جہاں معاشرتی، سیاسی، جغرافیائی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہیں اقدار کا نظام بھی متاثر ہوتا ہے ایک زمانے میں مروج اقدار دوسرے زمانہ میں معاشرتی منظر نامے سے غائب ہو جاتی ہیں۔ ایک دور کے قائم کردہ سماجی معیارات دوسرے دور میں اپنا رنگ تبدیل کر لیتے ہیں۔ ناول کا آغاز ۱۹۲۹ء کے زمانے سے ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب انگریز حکومت برعظیم پاک وہند میں پنجے گاڑ چکی تھی اور اپنے استحصالی عزائم پورے کرنے کی خاطر برعظیم کی عوام کو زیرِ عتاب رکھے ہوئے تھی تاہم مرکز سے دور دراز کے دیہاتی علاقوں تک یہ خبریں نہ پہنچ پاتی تھیں۔ وہاں کے لوگ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باعث معلوماتِ عامہ میں کوئی خاص دلچسپی بھی نہ رکھتے تھے اور وسائل بھی ناکافی تھے۔ مذہبی فرقہ واریت کی وبا ابھی نہ پھوٹی تھی۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے خوشی، غمی میں ساتھ رہنے والے، مذہب کے معاملے میں متعصب نہ تھے۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

"پنجاب کے دیگر دیہات کی مانند کوٹ ستارہ کی کچی گلیوں، جوہڑوں اور کھیتوں کے اوپر جو آسمان تھا وہاں تک کوئی ایک پکار نہ جاتی تھی۔ قرآن، گرنتھ اور رامائن کے ملے جلے مشترکہ سندیسے جاتے تھے۔۔۔ پر ان کا آپس میں اس لیے بیر نہ تھا کہ ان سندیسوں پر دھیان کم ہی دیا جاتا تھا۔ معاشرہ مذہبوں میں نہیں ذات برادری اور چوہدری اور کمی کمیوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان کے سامنے تہذیب کی حیثیت ثانوی تھی، جیسے، چٹھے، باجوے، گل، گھمن، وڑائچ، تارڑ، سندھو اور جاٹوں کی دیگر بے شمار گوتیں تہذیب سے نہیں ذات سے بندھی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے اکثر مسلمان تھے تو بہت سے سکھ بھی تھے اور وہ ایک ہی برادری تھے۔ مسلمان جاٹوں کے شادی بیاہ کے موقعوں پر برادری کے سکھ بھی پورے اہتمام سے شریک ہوتے۔ داڑھیاں سنوارتے، مونچھوں کو تاؤ دیتے اپنی کرپانوں پر ہاتھ رکھے شریک ہوتے۔ جہاں بارات اترتی دلہن کے گھر والے اُن کے لیے سوکھے راشن کا بندوبست کرتے تھے جسے اُن کا خصوصی باورچی دیگوں پر چڑھاتا تھا۔ وہ نیوندرا بھی ڈالتے۔" ۲

تقسیم کا شور اٹھا، دو قومی نظریے کی بات کی گئی۔ لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ جالندھر، امرتسر اور پٹیالے سے کٹ کٹ کر آنے والے لوگوں نے یہاں کے سکھوں اور ان کی عورتوں پر وہی ظلم کیے جو ان کے خاندانوں پر ہوئے تھے۔ آنکھوں سے انتقام کے شعلے اُبلنے لگے۔ پرانے تعلقات کی بنا پر سکھوں کا ساتھ دینے والے مسلمانوں کو بھی تہ تیغ کیا گیا۔ سب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے، گاجر، مولی کی طرح کٹ مرے ۔ تقسیم کے بعد نفسا نفسی کا عالم شروع ہو گیا۔ اخلاقی اقدار اور روایات کو پس پشت ڈال کر ہر شخص ذاتی مفاد کی خاطر دوسروں سے لڑنے لگا۔ عیش و آرام سے زندگیاں گزارنے والے مہاجر بن کر کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ ان میں سے ایک شخص کی سوچ کی عکاسی مستنصر حسین تارڑ نے اس طرح کی ہے:

"۔۔۔ کبھی میں بھی شہزادہ ہوا کرتا تھا، میرا ایک گھر تھا جو اس اداس اور اجڑے ہوئے کچے پکے گھر سے کہیں بڑھ کر شاندار اور شوکت والا تھا اور اس میں میرے دو شہزادے اور ایک شہزادی راج کرتے تھے۔۔۔ یہاں پہنچ کر جب میں نے ایک مدت کے بعد آئینہ دیکھا تو جو چہرہ مقابل تھا میرا نہ تھا۔۔۔ ایک کمی کمین، کم ذات کا چہرہ تھا۔۔۔ میں اپنے آپ کو پہچان نہ سکا۔" ۳

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

تقسیم کے فسادات کی آڑ میں کئی کمتر لوگ بڑی بڑی جائیدادوں اور جاگیروں کے دعویدار بن بیٹھے اور کئی لوگ تو اپنی ذات تک تبدیل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ذات کی بنا پر کمتری اور برتری کے معیار بگڑنے لگے، اشرافیہ رذیل ہو گئے اور رذیل، اشرافیہ کے مراتب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مال و دولت کے حصول میں کامیاب لوگ خود کو اعلیٰ حسب نسب کا مالک ظاہر کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ سرو سانسی کا بیٹا موجو، اسی افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو سید سلیمان شاہ اور اپنے باپ کو حسین بخش سید کہنے لگتا ہے۔ اس موقع پر مستنصر حسین تارڑ کا قلم اخلاق اور روایات کی تبدیلی کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ کرتا ہے:

> ”تیرے اس پاکستان میں کیا کیا کچھ نہیں ہو گیا۔ رسہ گیر، وڈیرے اور طوائفوں کی اولاد نواب زادے اور صاحب زادے وزیر کبیر ہو گئے تو اگر ہم سانسی۔۔۔ صرف اپنی شناخت تبدیل کر کے مسلمان اور سید ہو جاتے ہیں تو کسی کا کیا جاتا ہے۔۔۔ اور نہ ہی کوئی پرواہ کرتا ہے۔۔۔ ہم نے کسی کا حق تو نہیں مارا۔۔۔ تقسیم کے بعد جعلی کلیم داخل کروا کے ہندوؤں کی عالیشان کوٹھیوں اور گوداموں پر تو قبضہ نہیں کیا۔ یہاں تو گھسیارے اور نوابوں کی داڑھیاں اور زیر ناف بہت کچھ مونڈھنے والے بھی نواب بن گئے ہیں تو اگر میں نے کچھ ردو بدل کر کے۔۔۔ کچھ دے دلا کر شناخت کے سارے کاغذوں میں اپنے آپ کو اور ہم سب کو مسلمان اور سید ثابت کر دیا ہے تو کچھ جرم کیا ہے۔“ ۴

یہ سانسی لوگ مردار کھانے کی وجہ سے پلید سمجھے جاتے تھے۔ ان کی بستی سب سے الگ تھی۔ اور وہ جاٹ، کشمیری، شیخ، لوہار، ترکھان کسی کو بھی چھو نہیں سکتے تھے۔ لوگ اِن سے فاصلہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ گلی میں چلتے چلتے اگر سامنے سے کوئی دوسرا شخص آتا دکھائی دیتا تو سانسی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا اور بلند آواز میں اپنی موجودگی سے خبردار کرتا تاکہ دوسری جانب سے آنے والا شخص اس سے پرے ہو کر گزرنے کے لیے تیار رہے۔ سانسی کسی بھی باقاعدہ مذہب کو نہ مانتے تھے اور سب سے الگ تھلگ زندگی گزارنے میں خوش تھے۔ وہ معاشرتی اور سیاسی الجھنوں میں خود کو الجھاتے نہیں تھے اور اپنی زندگی میں مگن تھے۔ سرو سانسی اپنا تعارف اس طرح کرواتا ہے:

> ”ماسٹر جی۔۔۔ ہم شکایت کرتے ہیں اور نہ شکر کرتے ہیں۔۔۔ نہ کسی سے گلہ کرتے ہیں۔۔۔ اور نہ کسی کے گلے لگتے ہیں۔۔۔ یہ دین دھرم تو آپ جیسے بڑے لوگوں کی شناخت ہوتے ہیں۔۔۔ آپ مذہب کے خانے میں کچھ بھی لکھ لو۔۔۔ اگر لکھنا ہی ہے تو۔۔۔“ ۵

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

سانسی بچے، جانوروں کی مانند کودتے پھرتے اور جوہڑوں میں سے کچھوے، نیولے اور بلے پکڑتے۔ تعلیم کا حصول اِن کے لیے ناممکن ہی نہیں معیوب بھی تھا۔ سرو سانسی کی بیوی اپنے بچوں کے سکول بھیجے جانے پر اِس طرح احتجاج کرتی ہے:

"۔۔۔ مردار کے بچے تم نے میرے بچوں کو سبق پڑھا کر تختی لکھوا کر خراب کرنا ہے۔۔۔
کبھی کسی سانسی کے بچے نے بھی سبق پڑھا ہے یا تختی لکھی ہے۔ تو انھیں جوہڑوں میں سے
کچھوے پکڑنا سکھا۔ نیولے اور بلے دبوچنے کے فن سے آگاہ کر اور مردار کی بو سونگھ کر
گِدھوں سے پہلے اُس تک پہنچنے کے گُر بتا۔" ٦

وقت کی گردش نے جہاں بہت کچھ تبدیل کیا، وہیں ان سانسیوں کا رہن سہن بھی تبدیل ہو گیا۔ رذیل، اشرافیہ اور اشرافیہ، رذیل میں بدل گئے۔ سرو سانسی کے بیٹے موجو اور موتی سید سلیمان شاہ اور ابراہیم شاہ بن گئے اور یہ سلیمان شاہ محل نما گھر میں رہنے لگا اور اس کے گھر میں محفل میلاد کا اہتمام ہونے لگا۔ دورۂ قرآن، رمضان شریف میں اعتکاف اور تبلیغی سرگرمیوں میں معاونت کے ذریعے خود کو پرہیز گار اور عابد باور کروانے میں کامیاب ہو گیا۔

معاشرتی اور تہذیبی تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ پیسے کا حصول ہے۔ امیر بخش، سرو سانسی اور عزیز جہان، دو جاٹ زمیندار اور ایک سانسی جو کہ عام حالات میں ساتھ کھڑے بھی نہیں ہو سکتے، روپے کے حصول کے لیے، ایک مشترک مقصد کے حصول کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ یہاں وہ بندھن ٹوٹتے نظر آتے ہیں جو معاشرے نے صدیوں سے باندھ رکھے تھے۔ اخلاقی اقدار اور روایات کے بندھن بھی کمزور پڑنے لگتے ہیں۔ اپنے ملک میں روزگار کے وسائل کم ہوتے نظر آئے اور مغربی دنیا کی چکاچوند نے تیسری دنیا کے انسانوں کی آنکھوں کو چندھیا دیا تو انھوں نے مغرب کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ سرو سانسی کا بیٹا موتی، باہر جانے میں کامیاب ہو گیا اور وہاں ایک اچھا روزگار بھی حاصل کر لیا۔ ایک دفعہ پھر کسبِ معاش کے لیے سانسی اور جاٹ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ بخت جہان کا بیٹا اکبر جہان بھی اسی سلسلے میں کینیڈا چلا جاتا ہے۔ اکبر جہان جانتا ہے کہ موتی، سانسی ہے اور مردار خور ہونے کی وجہ سے پلید ہے لیکن پردیس میں جب اور کوئی دکھ بانٹنے والا نظر نہیں آتا تو وہ اس سانسی کے سامنے بیٹھ کر اپنے مسائل کا ذکر کرتا ہے اور اپنے دکھ بانٹتا ہے۔

ادھر پاکستان میں سید سلیمان علی شاہ جو کہ موجو ہے، اپنی پہچان تبدیل کر کے معزز بنتا ہے تو تنویر قاضی،

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

جو کہ سانسی نہیں ہے، کتے کی طرح دم ہلاتا اُس کی خدمت کرتا ہے۔ موجو اپنے بچوں کی شادیاں اعلیٰ گھرانوں میں کرتا ہے۔ سانسی نسل کا خون دوسرے گھرانوں کے خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ معاشرتی، اخلاقی، روایتی بندھن ٹوٹتے ہیں اور ایک نیا معاشرہ جنم لیتا ہے۔ یہ معاشرہ بے حس، خود غرض اور منافق ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس کی کوئی اخلاقی قدر نہ ہو، حتیٰ کہ ذات برادری کے بندھن بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس شکست وریخت کے بعد حصولِ رزق کے لیے وطن سے باہر جانے والوں میں پہل کرنے والا شخص سانسی ہے اور پھر جاٹ ان ملکوں کا رُخ کرتے ہیں۔ وہ سانسی جن سے کوئی اس لیے میل ملاقات نہ رکھتا تھا کہ کہیں وہ انھیں چھو نہ جائیں، اب جاٹوں کے لیے راستے ہموار کرتے ہیں، ان کے دکھ بانٹتے ہیں، ان کی خوشیوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور نئی نسل ان امتیازات سے ماورا ہو جاتی ہے۔ من وتو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آپس میں شادیاں کرنے لگتے ہیں۔ سروسانسی کی پوتی شباہت، بخت جہان کے پوتے سے شادی کا فیصلہ کرتی ہے تو سروسانسی کا بیٹا موتی سوچتا ہے:

> ''میری بیٹی۔۔۔ سروسانسی کی پوتی آج چودھری بخت جہان کے سگے پوتے سے بیاہی جائے گی۔
>
> ایک سانسی کی اولاد ایک ایسے پر تکبر جاٹ کی اولاد کی گھروالی ہو جائے گی جو اس نسل کو پلید جان کر اُسے ہاتھ لگانے سے بھی گریز کرتا تھا۔'' ۷

معاشرت کے حوالے سے سب سے خطرناک تبدیلی یہی ہے کہ اشرافیہ اور رذیل خاندان ایک ہو جائیں ۔ قانون قدرت ہے کہ انسان گروہوں اور قبیلوں میں بانٹے گئے ہیں تاکہ ان کی پہچان ممکن ہو لیکن اگر یہ گروہ اور قبیلے معاشرتی و معاشی تبدیلیوں کی وجہ سے ایک ہو جائیں تو پہچان ختم ہو جاتی ہے اور معاشرے کا توازن بگڑنے کا احتمال رہتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول میں تہذیب و معاشرت کے حوالے سے وقت کے منظر نامے پر تبدیلیاں دکھائی ہیں۔ یہ تبدیلیاں رویوں کی بھی ہیں، معیارِ زندگی کی بھی، اقدار کی بھی، رہن سہن کی بھی اور سوچ کی بھی۔ امیر بخش، عزیز جہان اور سروسانسی اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتے کرتے اپنی تعمیراتی کمپنی بنا لیتے ہیں۔ ایک اینٹ کے قائم رہنے کی دعائیں مانگنے والے بلند و بالا عمارات کھڑی کرنے کی ذمہ داری سنبھال لیتے ہیں۔ گھروں میں آسودگی آجاتی ہے تو ذہن بھی کشادہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ جاٹ بھی تعلیم کو برا سمجھتے تھے کہ یہ فرد کو جسمانی کمزوری کا شکار بنا دیتی ہے اور کہاں یہ عالم کہ سانسی بھی اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلواتا ہے۔ سوچ کا رُخ

تبدیل ہوتا ہے تو سروسانسی، جو کہ خود کو پلید سمجھتے ہوئے جاٹ، زمیندار سے فاصلہ رکھتا ہے، اپنی پوتی شباہت کو دیکھ کر اس لیے خوش ہو جاتا ہے کہ اس کی نسل میں ابھی وحشی پن باقی ہے۔ اس لیے ان کی نسلی خوبی معدوم نہیں ہو سکتی۔ مردار خور سانسی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں تو سوچ میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ موتی اپنی مغرب میں پلنے والی بیٹی شباہت کو پاکستان بھیجتا ہے تو اسے پاکستان کے وہ رواج اور اقدار سمجھاتا ہے جو اس کے ذہن پر نقش ہیں۔ وہاں کس طرح اٹھنا بیٹھنا ہے، نظریں جھکا کر رکھنی ہیں، کس سے بات نہیں کرنی، ہاتھ نہیں ملانا، سینہ تان کر نہیں چلنا، مغربی لباس نہیں پہننا اور کسی سے بحث نہیں کرنی لیکن شباہت جب پاکستان آتی ہے تو اس کے مشاہدہ میں یہ چیز آتی ہے کہ اس کے کزن اس سے زیادہ فیشن پرست اور عیش پسند ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو چومتے ہیں، بات بات پر قہقہے لگاتے ہیں اور اس قدر مغرب زدہ ہیں کہ شباہت ان میں پریشان حال اور دقیانوسی معلوم ہوتی ہے اور سوچتی ہے کہ اس کے باپ نے اسے کیوں پابند کیا تھا کہ پاکستان میں تو اسے کوئی پابندی نظر نہیں آئی۔

وقت کے بہاؤ میں پرانی اقدار، اخلاقیات اور روایات "خس و خاشاک" کی طرح بہہ جاتی ہیں اور ان کی جگہ نئی اقدار، اخلاقیات اور روایات لے لیتی ہیں۔ اکبر جہان جیسے لوگ پاکستان سے حصول رزق کی خاطر بیرون ملک کا سفر کرتے ہیں لیکن اتنی قربانی کے باوجود ان کی اولاد فرمانبردار نہیں ہوتی۔ یہی اکبر جہان اپنی ماں "بھاگ بھری" کے کہنے پر اپنی سوتیلی ماں اور ظالم باپ سے مل کر آتا ہے۔ اور سوتیلے بھائی کے جنازے میں شریک ہوتا ہے، اپنی ماں کے کہنے ہی پر کینیڈا کا رُخ کرتا ہے اور تنہائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن اس کی اولاد وقت کے بہاؤ میں ایسے بہہ جاتی ہے کہ سب کچھ تبدیل ہو جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے "خس و خاشاک زمانے" میں عہد بہ عہد تبدیل ہوتی تہذیب و معاشرت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ معاشروں میں تبدیلیاں بہ یک جنبش ابرو رونما نہیں ہوتیں بلکہ یہ تبدیلیاں وقت کے ساتھ رونما ہوتی ہیں لیکن ان کے قریب رہنے والوں کو اس تبدیلی کا ادراک نہیں ہوتا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ معمولی تبدیلیاں ایک بڑی تبدیلی کی صورت سامنے آتی ہیں اور اپنی اس حالت میں معاشرے کا حصہ بن جاتی ہیں تاوقتیکہ ان میں بھی مزید تبدیلی رونما ہو۔

حوالہ جات

۱۔ منشا یاد۔ آندھی کی طرح اڑتے ہوئے زمانے مشمولہ کتاب رسالہ۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اگست۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء۔ ص۵۶

۲۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔ ص ۲۲۲، ۲۲۳

۳۔ ایضاً۔ ص۳۵۷

۴۔ ایضاً۔ ص۳۸۳

۵۔ ایضاً۔ ص۳۱۵

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً۔ ص۶۵۵